ڈاکٹر علی شریعتی
سرخ تشیع
ترجمہ و حواشی علی اکبر شاہ

ڈاکٹر علی شریعتی کی

سرخ شیعت

ترجمہ و حواشی: علی اکبر شاہ

ناشر

رحمت اللہ بک ایجنسی۔ ناشران و تاجران کتب

بمبئی بازار نزد خوجہ شیعہ اثنا عشری مسجد کھارادر کراچی ۲

مجروح پھر ہے عدل و مساوات کا شعار
اس بیسویں صدی میں ہے پھر طرفہ انتشار
پھر نائبِ یزید ہیں دنیا کے شہریار
پھر کربلائے نو سے ہے نوعِ بشر دوچار
اے زندگی! جلالِ شہِ مشرقین دے
اس تازہ کربلا کو بھی عزمِ حسین دے

(جوش ملیح آبادی)

پیش لفظ

ڈاکٹر علی شریعتی مرحوم نے ستمبر ۱۹۷۲ء کو حسینیہ ارشاد اسلامی انسٹی ٹیوٹ میں ایک لکچر دیا۔ اس میں انہوں نے، اپنے مخصوص فلسفے کی وضاحت کی۔ جس کے لئے وہ سرخ شیعت کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ پہلی مرتبہ اس لکچر کا ترجمہ فارسی سے انگریزی میں کیا گیا اور شریعتی فاؤنڈیشن نے ۱۹۷۹ء میں تہران سے شائع کیا۔

جناب مدبر رضوی، پاکستان ٹیلی ویژن سے وابستہ، ایک علم دوست شخصیت ہیں اور کتابوں کے بڑے شوقین ہیں۔ انہوں نے یہ نادر کتابچہ مجھے پڑھنے کو دیا۔ میں ان کا بہت شکر گذار ہوں۔ اب میں اسے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر کے قوم تک پہنچا رہا ہوں کہ حالات کا تقاضا یہی ہے، اسے گروہی وابستگیوں اور ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر پڑھیئے اور اپنے ضمیر کی آواز کو سنیئے، یہ کتابچہ اچھی طرح سمجھا دے گا کہ ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ شہادت کا مذہب ماتم کا مذہب بن گیا۔

علی اکبر شاہ

۱۱ ستمبر ۱۹۸۲ء

ڈاکٹر علی شریعتی

ڈاکٹر علی شریعتی ۱۹۳۳ء میں مشہد (ایران) کے نواحی علاقہ مزینان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم مشہد میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم فرانس میں سوشیالوجی میں ڈاکٹریٹ کرکے ۱۹۶۴ء میں وطن واپس لوٹے تو سرحد پر ہی گرفتار کرلئے گئے۔ الزام یہ تھا کہ فرانس میں دورانِ تعلیم سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔ ۱۹۶۵ء میں آزاد ہوئے تو مشہد یونیورسٹی میں تعلیم دینا شروع کردی، وہ مسلم معاشرے کے مسائل معلوم کرتے اور انہیں اپنے شاگردوں کے سامنے پیش کرتے۔ ان مسائل پر بحث کی جاتی۔ اس طرح سے ڈاکٹر شریعتی اپنے شاگردوں اور ایرانی معاشرے کے مختلف طبقوں میں کافی مقبول ہوگئے۔ یہ مقبولیت جابر حکومت کو کھلنے لگی تو وہاں سے تعلیم کا سلسلہ ختم کردیا گیا۔ پھر تہران تبادلہ کردیا گیا۔ یہاں آپ نے بڑے سرگرم اور دلکش انداز سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ حسینِ ارشاد ریلیجس انسٹی ٹیوٹ میں آپ کے لیکچر صرف شاگردوں ہی کے لئے وجہ کشش نہ تھے، بلکہ مختلف ذہنی سطحوں کے ہزاروں افراد بھی آپ کے گرویدہ ہوگئے۔ اس گرویدگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی ایک کتاب کے پہلے ایڈیشن کی ساٹھ ہزار کاپیاں حکام کی مداخلت اور رکاوٹوں کے باوجود بڑی تیز رفتاری سے فروخت ہوگئیں۔ شہنشاہیت کے لئے یہ صورت حال ناقابلِ برداشت تھی۔ چنانچہ حسینِ ارشاد انسٹی ٹیوٹ کو ایرانی پولیس نے گھیر لیا۔ اور ان کے ہزاروں عقیدت مندوں کو گرفتار کرلیا۔ ڈاکٹر علی شریعتی کی سرگرمیاں رک گئیں۔ دوسری مرتبہ جیل بھیج دیئے گئے اور ۱۸ ماہ قید خانہ میں بڑے کٹھن حالات

میں گذار دیئے۔ پھر بین الاقوامی احتجاج اور عوامی دباؤ کی وجہ سے ۲۰ مارچ ۱۹۷۵ء کو رہا کردیئے گئے۔ مگر سکیورٹی والوں کی سخت نگرانی رہی۔ یہ وہ صورت حال تھی کہ نہ تو آپ کچھ چھپوا سکتے تھے اور نہ ہی اپنے شاگردوں سے رابطہ قائم کرسکتے تھے۔ چنانچہ آپ نے رسول اللہ کی سنت کو سامنے رکھتے ہوئے ہجرت کا فیصلہ کیا اور آپ انگلینڈ پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ ابھی تین ہی ہفتہ گذرے تھے کہ شاہ کے ایجنٹوں نے آپ کو ۱۹ جون ۱۹۷۷ء کو شہید کردیا۔

ڈاکٹر علی شریعتی نے مختلف مذہبی، معاشرتی اور فلسفیانہ مکتب ہائے فکر کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ دنیا کے چوٹی کے ماہر عمرانیات تھے۔ انہوں نے شاہ کے جابرانہ دور میں احیاء اسلام کا کام شروع کیا۔ انہیں خاص طور سے نوجوانوں کے بارے میں یقین تھا کہ انہیں اپنے عقیدے کی سچائی پر یقین ہو تو وہ اپنے آپ کو وقف کردیں گے اور ایک باعمل مجاہد بن جائیں گے۔ ایسا مجاہد کہ جسے اپنے نظریات کے آگے کچھ بھی عزیز نہیں ہوتا۔ نہ جان نہ مال! اور اس طرح سے یہ نوجوان معاشرے میں انقلاب برپا کردیں گے۔

سرخ شیعت: مذہب شہادت

سیاہ شیعت: مذہب ماتم

اسلام وہ مذہب ہے کہ جو محمدؐ کی ایک "نہیں" کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ حضرت محمدؐ وارثِ ابراہیم تھے اور ایسے مذہب کا مظہر کہ جس کی بنیاد وحدانیت الہی اور وحدت انسانی پر تھی۔ آنحضرت کی یہ "نہیں" وحدانیت کی صدا کے ساتھ شروع ہوتی ہے یہ وہ صدا تھی کہ جسے اسلام نے دوبارہ روشناس کرایا اور یہ وہ وقت تھا کہ مدمقابل جاہ پرستی اور مصلحت پسندی تھی۔

شیعت ایک ایسا اسلام ہے کہ جس نے علی جیسے عظیم انسان کی ایک "نہیں" سے اپنے آپ کو پہچنوایا اور تاریخ اسلام میں اپنی راہ متعین کی۔ علی وارثِ محمدؐ تھے

---

۱. غیر اللہ سے انکار۔

۲. حضرت عمر ابن خطاب نے وقت آخر خلیفہ کے انتخاب کے لئے ایک کمیٹی بنادی تھی۔ یہاں عبدالرحمن ابن عوف کو ایک خاص حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ جب انتخاب خلیفہ کے مسئلہ نے طول کھینچا۔ اور کوئی بات طے نہ ہو سکی تو عبدالرحمن نے اپنے تئیں ثالث مقرر کروالیا اور علی کو خلافت اس شرط کے ساتھ پیش کی کہ وہ قرآن و سنت کے ساتھ سیرت شیخین یعنی ابوبکر اور عمر کی سیرت پر عمل کرتے ہوئے امور خلافت انجام دیں گے۔ مگر حضرت علی نے سیرت شیخین پر چلنے پر انکار کر دیا۔ اگر آپ ذرا سی "ہاں" کر دیتے تو خلافت آپ کے قدموں میں تھا۔ پھر چاہے عمل کرتے یا نہ کرتے (جیسا کہ عثمان نے کیا) مگر آپ نے "نہیں" کردی۔ اور یہ "نہیں" آپ کے ماننے والوں کے لئے اصول پرستی اور ظلم سے برأت کی علامت بن گئی۔

اور ایسے اسلام کا مظہر کہ جس میں اصل تھا اور حق تھا۔ یہ "نہیں" خلافت کی انتخابی کمیٹی کے سامنے کہی گئی۔ یہ عبدالرحمن ابن عوف کا جواب تھا اور یہ عبدالرحمن جاہ پرستی مصلحت پسندی کا مظہر تھا۔[1]

یہ "نہیں" صفوی دور سے پہلے تک تاریخ اسلام میں شیعہ تحریکوں کا حصہ تسلیم کی جاتی ہے۔ یہ اس گروہ کے سماجی اور سیاسی کردار کی علامت تھی کہ جو علی کے ماننے والوں اور خاندانِ رسالت کے کرم سے وابستہ کی حیثیت سے جانا جاتا تھا یہ وہ پارٹی ہے۔ جس کا انحصار قرآن اور روایات پر ہے مگر وہ قرآن اور روایات نہیں جس کا اعلان اموی، عباسی، غزنوی، سلجوقی، منگول اور تیموری سلاطین کرتے تھے۔ بلکہ یہ تو وہ قرآن و روایات ہیں کہ جن کا اعلان محمدؐ کا گھرانہ کرتا تھا۔

تاریخ اسلام ایک عجیب و غریب راستہ اختیار کرتی ہے یہ وہ راستہ ہے کہ جس میں عرب فارس، ترک، تاتار اور منگول سلاطین، سب کے سب بدمعاش

---

۱. عبدالرحمن ابن عوف کا تعلق زہری قبیلہ سے تھا۔ ماں بنوامیہ سے تھیں۔ حضرت ابوبکر کے کہنے سے اسلام کا اقرار کیا۔ بی بی فاطمہ نے ابوبکر کے پاس وارثت کا دعویٰ کیا تو یہی صاحب تھے کہ جنہوں نے بڑی ڈھٹائی سے اس من گھڑت حدیث کی تائید کی کہ جسے حضرت ابوبکر نے بنت رسول کی تکذیب کرتے ہوئے پیش کیا تھا اور حدیث یہ تھی: "ہم گروہ انبیاء ہیں، ہم کوئی میراث نہیں چھوڑتے۔ اپنے پیچھے ہم جو کچھ چھوڑیں گے وہ صدقہ ہوگا۔"

ان صاحب کا انتقال ہوا تو چاروں طرف دولت کے ڈھیر لگے ہوتے تھے۔ اتنی بڑی بڑی سونے کی اینٹیں تھیں کہ کلہاڑی سے کاٹ کاٹ کر وارثوں میں تقسیم کی گئیں۔ سونے کے علاوہ ایک ہزار اونٹ تین ہزار بکریاں، ایک سو گھوڑے اور ایک بہت بڑا کھیت تھا۔ بڑے بڑے محلات الگ۔

قرآن تو سونا و چاندی جمع کرنے والوں کو دوزخ کی بشارت دیتا ہے۔ مگر مسلمان ان کو عشرہ مبشرہ میں شامل سمجھتے ہیں۔ یعنی رسول اللہ نے انہیں جنت کی بشارت دی۔ یہ کیسا تضاد ہے؟

اور گندے لوگ، محمدؐ کے گھرانے اور امیر برحق کو نکال کر مسلم معاشرے کی سربراہی اور پیغمبرِ اسلام کی خلافت کے حقوق سے مستفید ہوتے ہیں۔

شیعیت ایک "نہیں" سے شروع ہوتی ہے۔ وہ "نہیں" جو تاریخ کی منتخبہ راہ کی مخالفت کرتی ہے۔ تاریخ سے بغاوت کرتی ہے، اس تاریخ سے بغاوت کرتی ہے کہ جو بادشاہوں اور قیصروں کے نام پر جہل کی راہ اختیار کرتی ہے اور روایات کے نام پر انہیں قربان کر دیتی ہے کہ جو قرآن اور مذہبی روایات کی آغوش میں پلے تھے۔

شیعہ اس راستے کو قبول نہیں کرتے ہیں۔ جسے تاریخ پسند کرتی ہے وہ اس سربراہی کا انکار کرتے ہیں۔ جس کا تاریخ پر غلبہ تھا اور جس نے نیابت پیغمبر کے ذریعے اکثریت کو دھوکے میں رکھا اور تب اسے اسلام کی حمایت بھی کرنا پڑی اور کافروں سے جنگ بھی۔

شیعوں نے پر ہجوم مسجدوں اور خلفائے اسلام کے عالیشان محلوں سے پیٹھ پھیر لی اور اپنا رخ فاطمہؑ کے کچے اور ویران گھر کی طرف کر لیا۔ شیعہ جو کہ نظامِ خلافت میں انصاف کے متلاشی اور کچلے ہوئے طبقہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس گھر میں وہ سب کچھ پا لیتے ہیں کہ جس کی انہیں تلاش رہی ہے۔

فاطمہؑ : وارثِ محمدؐ اور کچلے ہوئے طبقہ کے حقوق کی مظہر اور ساتھ ہی ساتھ پہلے اختلاف کی نشانی ہیں۔ انصاف کی متلاشی، جیتی جاگتی تصویر ہیں۔

علیؑ : مجسم عدل، جو پسے ہوؤں کی خدمت کرتا ہے۔ وہ حق ہی حق ہے مگر لوگوں کو شعور نہیں۔ وہ اس غیر انسانی دورِ حکومت کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے کہ جس کے حکمران رنگ مذہب کے دبیز پردوں میں چھپے ہوتے ہیں۔

حسنؑ : لشکرِ امامت اسلام کی آخری مزاحمت کا مظہر۔

حسینؑ : ظالموں کے ہاتھوں شہید ہونے والوں پر گواہ۔ آدم سے لیکر اب تک کے تمام آزادی کے علمبرداروں اور عدل و مساوات کے طالبوں کا وارث، ہمیشہ کے لئے شہادت کا پیامبر اور خونِ انقلاب کا نقیب۔

زینبؑ : جلادی نظام میں اپنی مدافعت سے مجبور تمام قیدیوں پر گواہ پیامبر بعدِ شہادت اور صدائے انقلاب۔

شیعہ دکھ کے جھیلوں اور پسے ہوئے عوام کی امیدوں میں اپنے نعروں کا ادراک کرتے ہیں۔

حکمرانوں سے ہوشیار ہو جاؤ، وہ پکار اٹھتے ہیں۔!

"علیؑ کی رہنمائی کی جستجو کرو اور ظلم کی رہنمائی سے بچو"

"امامت کو اپناؤ اور خلافت کی پیشانی پر استبداد، بے یقینی اور غصب کی مہر لگا دو۔"

"عدل کو اپناؤ اور غیر حقیقی نظام و حقوق ملکیت کے امتیازات کو اکھاڑ پھینکو۔"

"موجودہ صورت حال کے خلاف احتجاج کرنے میں صبر کی راہ اختیار کرو"

یہ لتروہ صورتِ حال ہے کہ جس میں حکومت، مذہبی لیڈر اور طبقہ امرا یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ یہاں ہر چیز خدا کی مرضی، خدائی قوانین کے مطابق ہے اور جس سے خدا بھی راضی ہے اور بندے بھی۔ یہاں ہر چیز الٰہی کی ذات سے متعلق ہے۔ اس میں فتوحات، مساجد کی غارتگرانہ تشکیل، انجمنیں، اسکول

ٹرسٹ، متحالف، خیراتیں اور مذہبی شعار و اعمال کی پابندی سب کچھ شامل ہے۔

"تحریک کی مرکزیت کے لئے مذہبی رہنمائی (مرجع) کو اپناؤ"

"توانائیوں کی تنظیم، ضابطہ، تربیت اور رہنمائی کے لئے تقلید کو مانو"

"ذمہ دار راہبر پانے کیلئے "نیابت امام" کو اختیار کرو"

سماجی و سیاسی جدوجہد، تعلیمی امدادی اداروں اور تعلیم کے لئے اپنے مال میں سے حصہ دو" کیونکہ ایسے نظام میں زندہ ہو جہاں حکومت ایک قانونی حکومت کی طرح تمام مذہبی واجبات وصول کرتی ہے۔

عزاداری کو اپناؤ ——— غصب، دغابازی اور فریب کاری انحطاط اور ظلم کے خلاف شیعوں کی تاریخی جدوجہد کو جاری رکھنے اور خاص طور سے شہیدوں کی یاد کو زندہ رکھنے کیلئے۔[1]

"عاشورہ کو یاد رکھو ——— حکمراں گروہ کو رسوا کرنے کیلئے۔ یہ گروہ اپنے آپ کو روایات پیغمبر کا وارث کہتا ہے۔ مگر یہ یاد ثابت کرتی رہے گی کہ یہ لوگ پیغمبر کے گھرانہ کے قاتلوں کے وارث ہیں"

۱- ہم عزاداری کو اپنائے ہوئے ہیں۔ گھر گھر مجلس و ماتم، بڑی بڑی مجلسیں، چھوٹے بڑے سینکڑوں ماتمی جلوس، گریہ وزاری اور سینہ زنی۔ اس طرح سے ہر سال ہم دو مہینے آٹھ دن شہیدوں کی یاد مناتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اگر اتنی پاک ہستیوں پر رونے والے اور سینہ زنی کرنے والے بھی دوسروں کا مال غصب کریں، دھوکہ دیں اور فریب کاری میں مبتلا ہوں۔ ظلم کریں اور ظلم دیکھ کر اس طرح سے خاموش رہیں کہ جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ ہم مجلس کے بعد زیارت حضرت علی اکبر پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لعن اللہ امۃ قتلتک ولعن اللہ امۃ ظلمتک ولعن اللہ امۃ سمعت بذالک فرضیت بہ - ہم علی اکبر کے قاتلوں، ظالموں اور یہ

یہ یاد عمل کی راہ دکھائے گی اور اس متواتر سوال کا جواب دے گی کہ کیا ہونا چاہیئے؟ یہ استبدادی حکومت کے خلاف جدوجہد کے طریقے کے بارے میں فیصلہ کرنے میں مدد دے گی۔ یہ ظلم کی نمک حلالی سے بچائے گی۔ یہ تاریخ کے غیر منقطع تسلسل کو منتخب کرے گی۔ یہ وارثِ آدم اور وارثِ شیطان کے درمیان دائمی جدوجہد کا اعلان کرتی ہے۔ عاشورہ اس دائمی حقیقت کو یاد دلاتا رہے گا۔ کہ موجودہ اسلام روایات کے لباس میں مجرم اسلام ہے اور حقیقی اسلام شہادت کے سرخ لبادہ میں پوشیدہ ہے۔

تقیہ انجمنوں، سرگرمیوں، روابط، شخصیتوں، طاقت کے تحفظ کے منصوبوں، اشخاص اور گروہوں کو حکمرانِ وقت کی ایذا رسانیوں سے بچانے کی فنکارانہ صورت پیدا کرتا ہے۔ ان حکمرانوں سے تعلق رکھنے والے مذہبی گروہوں کی شقی القلبی یا تو انہیں (شیعوں کو) غیر مسلم قرار دے کر اور ان کے خلاف جاہل عوام کو کھڑا کر کے شیعہ تحریک کو بدنام کر سکتی ہے یا اسے اذیت رسانی کے ذریعہ تباہ کر سکتی ہے یا بڑے پیمانے پر قتل، قید اور جلا وطنی کے ذریعہ کمزور کر سکتی ہے نتیجتاً اخفاء کے اصولوں کے تحت جدوجہد کی راہ ہموار ہوتی ہے اور خفیہ جدوجہد کی خاص شرائط برقرار رکھی جاتی ہیں۔

ہم مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ آٹھ سو سال سے علوی شیعت، تاریخ میں محض

ظلم کی داستان سن کر خاموش اپنے والوں پر تو لعنت بھیجتے ہیں۔ مگر ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہمیں بھی ظلم سے بچنا چاہیئے۔ ہمارے ذاکر کیوں خاموش ہیں۔ کاش کہ ان کا تدریجاً یہ رخ بھی اختیار کر لیا کرے۔

ایک انقلابی تحریک نہیں تھی کہ جس نے اموی اور عباسی دورِ خلافت اور پورے طبقہ واری نظام اور غزنوی، سلجوقی، منگول اور تیموری بادشاہت کی مخالفت کی کہ جنہوں نے سنی مکتبۂ فکر کو سرکاری مذہب بنا لیا تھا اور جنہوں نے فکر و عمل کی خفیہ تحریک چلائی۔ بلکہ ایک انقلابی پارٹی کی طرح شیعت ایک انتہائی منظم آگاہ، گہری اور بالکل واضح فکر رکھتی تھی۔ اس کے پاس صاف اور قطعی نعرے تھے۔ منظم اور نیم سنتوری جماعت تھی۔ یہ محروم اور پسے ہوئے عوام کی آزادی اور انصاف کے لئے جدوجہد میں ان کی رہنمائی کرتی تھی۔

اپنے حقوق کے حصول کی جستجو کرنے والے دانشوروں کے مطالبے، ان کے دکھ اور ان کی بغاوتیں اور عوام کی تلاش عدل۔ یہ دونوں ایک نقطۂ اتحاد خیال کئے جاتے ہیں۔

یہ اسباب تھے کہ تاریخ کے پورے دور میں، ان کی طاقت میں اضافہ ہوا تو عوام پر دباؤ اور بے انصافی میں بھی اضافہ ہو گیا۔ لوٹ کھسوٹ اور عوامی حقوق کی پائمالی بڑھ گئی اور کسانوں کے استحصال میں زیادتی ہو گئی۔ اشرافی نظام، ذہنی غلامی، نظریاتی تعصبات علماء دین کا دنیاوی حکمرانوں سے لگاؤ۔ عوام کی غربت و افلاس اور حکمرانوں کی طاقت اور دولت کی وجہ سے تضادات اور نمایاں ہو گئے۔ جب یہ ہوا تو شیعوں کی صفیں مضبوط تر ہو گئیں۔ تحریک کے بنیادی نعرے زیادہ شدید ہو گئے، شیعت کی تحریک اور ترقی ہو گئی۔ اس نے ایک مکتبۂ فکر کے انداز نظر اور مذہبی فرقہ بندی کو جو کہ دانشوروں اور چند مخصوص لوگوں ہی کے لئے تھی، صحیح اسلامی فہم اور پیغمبر کے گھرانے کے افراد کی تہذیبی معرفت سے بدل دیا۔ جبکہ

اس کے مدمقابل یونانی فلسفہ اور مشرقی تصوف تھا۔ اسے انقلابی، عوامی اور خصوصاً دیہی عوام کی سیاسی و سماجی تحریک میں بدل دیا گیا۔ جس کی وجہ سے مطلق العنان بادشاہوں اور مذہبی بہروپیوں جو کہ سنی فرقہ کے نام پر لوگوں پر حکومت کرتے تھے، شدید خوف پیدا ہو گیا۔

یہی وجہ ہوتی ہے کہ بے اصل دانشور اور آزاد خیال حکمران، جن کے درباروں میں یہودی، عیسائی ساحر یہاں تک کہ مادہ پرست تک، آزادی و عزت، اور اثر و رسوخ سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ مگر شیعوں کے خلاف اتنی ناراضگی اور غصے کا چرچا کہ ان کا قتل عام بھی ان حکمرانوں کی پیاس نہیں بجھا سکا وہ زندہ انسانوں کی کھال کھینچتے ہیں، ان کی آنکھوں میں لوہے کی سلائیاں بھونکتے ہیں۔ ان کی زبانیں کھینچ لیتے ہیں۔ اور ان کو زندہ جلا دیتے ہیں۔ یہ سب اس زمانے کا عام رواج تھا۔ یہ بات اس حد تک یقینی ہے کہ مورخین علماء دین، فلسفی اور مقدس درباری، جو کچھ بھی جھوٹے الزامات اور فریب کاریاں شیعوں کے خلاف کر سکتے، وہ کرتے اور انہیں اپنی عبادت کا حصہ سمجھتے۔

یہ وہ حالات ہیں کہ سلطان محمود غزنوی باقاعدہ اعلان کرتا ہے کہ " میں تو دنیا بھر میں شیعوں کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔" یہ اسی کی حکومت ہے کہ جس نے سنی علماء دین کو اس بات کا ضامن بنایا کہ ایک مسلمان کی یہودی، عیسائی اور زرتشتی کے ساتھ شادی تو قانون کے مطابق تصور کی جائے مگر شیعہ عورت کے ساتھ شادی کو غیر قانونی قرار دیا جائے۔

سلجوقیوں کے برسر اقتدار آنے کے ساتھ ساتھ فکر و مذہب کی دنیا میں تنگ

نظری اور تعصبات شدید ہو جاتے ہیں۔ جاگیرداری اور سرداری نظام سماجی نقطۂ نظر سے، عوام، خاص طور سے کسانوں کے استحصال کو ناقابلِ برداشت حد تک بڑھا دیتا ہے۔ ریاست کی پالیسیوں کو برقرار رکھنے کے لئے کوڑے مارنا اور اذیت پہنچانا ضروری قرار پاتا ہے۔ کثرت سے کھوپڑیوں کے مینار تعمیر ہوتے ہیں۔

سنی فرقہ کہ جو شروع ہی سے، حکومت کا اسلام، ہوتا ہے۔ زیادہ تر بے بنیاد اور متعصبانہ عقائد اور سخت قوانین کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ یہ حکمرانوں کے غیر انسانی طریقوں کو جائز بنانے میں ایک آلۂ کار کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ یہ غزنوی سلجوقی، ترک اور منگول جیسی جابرانہ حکومتوں سے سمجھوتا کرتا ہے۔ یہ عوام کے لئے افیون کا آمیزہ ثابت ہوتا ہے اور ایک ایسا آلۂ قتل کہ جو کسی ایسے نظریے یا عمل کے خون کے لئے ہو جس سے طاقتوروں کے مفادات کو خطرہ ہوتا ہے اور جاگیرداروں اور زمینداروں کو نقصان پہنچتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شیعت اس دور میں مظلوم عوام، خاص طور سے دیہی عوام کی بغاوت اور جد و جہد کے سرچشمہ کی حیثیت سے ظاہر ہوتی ہے۔ شیعت نے ان مختلف عوامی تحریکوں کو ہمہ پہلو و ہمہ جہت، درمیانی یا انتہائی درجہ تک حیرت انگیز طور پر پروان چڑھایا۔ یہ تحریکیں اس زمانے کی تمام طاقتوں کے خلاف تھیں، جیسے حسن بن صباح[1] کی دہشت گردی، قرامطہ[2] کی فرقہ واریت۔ غلاط کے

۱۔ علی بن الصباح الحمیری کا بیٹا، کوفے یا رے کا باشندہ، اس کی تاریخ پیدائش کا ذکر نہیں ملتا۔ مگر جب فاطمی دعوت کی تبلیغ پر مائل کیا گیا۔ تو یہ نوجوان تھا۔ ایران کے فاطمی داعیِ اعظم ابن عطاش نے اسے ۱۰۷۱ء یا ۱۰۷۲ء میں اپنا نائب مقرر کیا۔ ۱۰۹۰ء یا ۱۰۹۲ء

انتہا پسند ثقافتی و مذہبی عقائد اور بعض صوفی فرقوں کی بغاوتیں کہ جن کا تعلق انقلابی اور شیعہ مکتبۂ فکر سے تھا۔ یہ بغاوتیں اس نظام احتساب کے خلاف تھیں کہ جس کا تعلق سخت، متعصبانہ بے روح اور مردہ کر دینے والے مذہبی اور قانونی نظام سے تھا۔

الغرض عاقلانہ، بیش قیمت اور حیات بخش مدرسہ امامت کہ سرکاری مذہب کو جب بھی اس کے مدمقابل ہوا۔ اس نے فکر و تمدن کے عظیم دھارے کی حیثیت سے بغاوت کی۔

اس مدرسہ کو دعوت بیداری اور علمی ممکنات کی بنیاد امامت اور عدل کے

میں پہلے تو اس نے الموت کے سنگین قلعہ پر تصرف حاصل کیا۔ پھر مختلف تدابیر سے اور بھی قلعے اپنے قبضہ میں کر لئے۔

المستنصر (فاطمی خلیفہ) کی وفات کے بعد جانشینی کے مسئلہ پر اختلاف ہوا تو حسن بن صباح نے نزار کی امامت کی حمایت کی۔ پھر اسے ۱۱۱۰ء میں پوری نزاری تحریک کا امیر تسلیم کر لیا گیا۔ اسے فرقہ حشیشین کا داعیِ اعظم بھی کہا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ حسن بن صباح اپنے مریدوں کو حشیش پلا کر اپنی جنت (مصنوعی) کی سیر کراتا تو اسی جنت میں واپسی کی کشش انہیں حسن بن صباح کا ہر حکم ماننے پر مجبور کر دیتی۔ چنانچہ حسن بن صباح نے اپنے بڑے بڑے مخالفین کو کہ جن میں جید علماء اور حکام شامل تھے (اپنے مریدوں کے ذریعے موت کے گھاٹ اتروا دیا۔ اس نے کافی عرصہ قتل و غارتگری کا بازار گرم رکھا۔

۲۔ یہ قرمطی کی جمع ہے۔ اس تحریک کا پہلا قائد حمدان قرمط تھا۔ اس کی بنیاد اشتراکی نظام پر تھی۔ دستکار، کسان اور عوام دائرے اثر میں تھے۔ خراسان، شام اور یمن خاص اڈے تھے۔ جہاں سے شورشیں ہوا کرتی تھیں۔ اس تحریک کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں شمولیت کے لئے بعض رسوم بجا لانا پڑتی تھیں۔ اس تحریک کا زمانہ نویں صدی عیسوی تا بارہویں صدی عیسوی کا ہے۔

جڑوں اصولوں پر ہے۔ یہ موجودہ حالات کے خلاف "عاشورہ" کا انقلابی نعرہ اور عوام کا جارحانہ اجتماع فراہم کرتی ہے۔ یہ لوگوں کو امام غائب کے انتظار کی دعوت دیتی ہے کہ جو پردہ غیبت میں ہیں۔ یہ ظہور کی نشانیوں اور زمانہ کے اختتام جیسے نازک مسائل سامنے لاتی ہے۔ یہ نجات بعد شہادت کی امید کو زندہ رکھتی ہے۔ یہ انقلاب اور انتقام کے نظریئے کو فروغ دیتی ہے۔ یہ جابر حکمرانوں کے زوال کا یقین دلاتی ہے اور ان حکمران طاقتوں کی قسمت کا فیصلہ کرتی ہے کہ جو تلوار کے ذریعہ عدل قائم کرتی ہیں۔ یہ ان تمام مظلوم اور عدل کے متلاشی عوام کو تیار کرتی ہے کہ جو انقلاب میں حصہ لینے کا انتظار کر رہے ہیں۔

کچھ شہروں میں جیسے کاشان اور سبزوار، جہاں شیعہ طاقت رکھتے ہیں وہ ہر جمعہ کو ایک سفید گھوڑا تیار کرتے ہیں۔ شہر کے تمام ناخوش و احتجاجی لوگ اور منتظر شیعہ، حکمران مذہب اور حکومت کی مخالفت کے باوجود شہر کے باہر گھوڑے کے پیچھے پیچھے جاتے ہیں۔ وہ جابر حکمرانوں سے نجات و آزادی اور آغاز انقلاب کا انتظار کرتے ہیں۔ وہ ایسے بحث طلب امور پر گفتگو کرتے ہیں کہ جن سے حکمران طبقہ خوف زدہ ہو جاتا ہے۔

آٹھویں صدی کے پہلے نصف حصہ میں چنگیز اور ہلاکو کے بڑے پیمانہ پر قتل کے بعد منگولوں کی حکومت نے ایرانی عوام کو کمزوری، اطاعت، پستی اور ذلت پر مجبور کر دیا تھا۔ چنگیز کے انتقام کو قانونی حیثیت حاصل تھی۔ تلوار اور جلاد کے ذریعے قانون کا نفاذ ہوتا تھا۔ منگول خواتین اور خانہ بدوش اور منگول قبائلی سردار اور جاگیردار سب کے سب مختلف علاقوں اور ریاستوں پر حکومت کرتے

تھے اور بڑی بے رحمی سے کسانوں کو اپنا غلام بناتے تھے۔ شہروں میں بھی مذہبی لوگ زیادہ تر منگول حکمرانوں کی ملازمت میں تھے۔ وہ عوام پر زور دیتے تھے کہ سچے سنی مذہب کے نام پر بے اصل حکمرانوں کی اطاعت کریں جو اصل چنگیزی نمونے کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ یہ حکمران صرف مسلمانوں کے مذہبی جذبات کی تسلی کے لئے ختنہ کرواتے تھے۔

کچھ مذہبی لوگ جو اپنی پارسائی کی وجہ سے حکمرانوں اور ظالموں کے تعاون سے تو دور رہے مگر پارسائی کی گمنامی کو گلے لگاتے خاموشی سے صوفیوں کی خانقاہوں میں چلے گئے جس کی بدولت بالواسطہ ظلم کو راہ ملی اور قتل کے لئے زمین ہموار ہوئی۔ وہ لوگوں کو منگول عاملوں، ڈاکوؤں اور مکار مذہبی لوگوں کے کوڑے کھانے کے لئے بے سہارا چھوڑ چکے تھے۔

ان حالات میں ایک مذہبی مبلغ سلمان فارسی کی طرح سچائی کی تلاش میں چل پڑتا ہے وہ ان سب کے پاس پہنچتا ہے کہ جو مذہبی عقائد کے دعویدار تھے۔ سب سے پہلے راہ نجات کی تلاش میں مقدس بیلو کے پاس حریت و پارسائی کے مدرسہ میں پہنچتا ہے۔ وہاں اس نے دیکھا کہ پارسائی ظلم کے سامنے خاموش ہے۔ کتنے شرم کی بات ہے۔ کیا بے رحمی اور خود غرضی ہے کہ ایک شخص کے ہر طرف بھوک۔ غربت۔ اسیروں کی سسکیاں۔ سزا دینے والوں کی دہاڑیں۔ مجبور جسموں پر برسنے والے کوڑے ہوں۔ مگر وہ شخص ان کا دفاع کرنے کے بجائے صرف اپنی نجات تلاش کرے اور جنت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

وہ اس آدمی کے ساتھ سے نفرت کے عالم میں چلا جاتا ہے۔ پھر رکن الدین

عمادالدولہ کے پاس سمنان جا پہنچتا ہے۔ رکن الدین صوفی اصولوں پر عامل ایک پارسا رہنما کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا تھا۔ وہ دیکھتا ہے کہ صوفی معمولات بھی حقیقتوں سے فرار کا ایک راستہ ہیں۔ وہ عوام کی قسمت سے چشم پوشی اور جبر و بے رحمی سے لاعلمی کو دیکھتا ہے۔ وہ رکن الدین کو نیک دل نازک احساسات اور اور پاکیزہ روح والا پاتا ہے۔ لیکن یہ کیا ہے کہ اس ملک میں منگولوں کے ہاتھوں خون کے دریا بہائے جا رہے ہیں۔ جس سے اسلام کے زوال اور لوگوں کی پستی کا خطرہ ہے۔ مگر کسی بھی طرح اس کی لطافتِ قلب اور اس کی روح کا سکون دا غدار نہیں ہوتا۔

وہ نفرت کے جذبات لئے اس کے پاس سے بھی چلا جاتا ہے۔ پھر شیخ الاسلام امام غیاث الدین حبیب اللہ حموی کے پاس بہادر آباد جاتا ہے۔ تاکہ سچے سنی فرقے کے دینیات کا علم حاصل کرے اور حقیقتِ صدق کی راہ کو پالے۔ یہاں وہ ایسی دینیات دیکھتا ہے کہ جو آدابِ طہارت پر گفتگو کرتی ہے اور ہزاروں مسائل دریافت کر لیتی ہے لیکن اس بدقسمتی کے بارے میں کہ جس کا قوم کو سامنا ہے، ہر طرح کی آگہی کا فقدان ہے۔

ان تقدس کی قباؤں سے متنفر اور اس بات پر مطمئن کہ یہ سب اس لباسِ تقدس کے بنے والے ہیں کہ جو ظلم کے جسموں پر ہوتا ہے۔ منگول حکمرانوں کی نفرت سے معمور قلب کے ساتھ، مسلم عوام کی بدقسمتی کے درد کے بوجھ تلے، افتاں و خیزاں، ایک ذمہ دار مسلمان کی حیثیت سے، زمانے کو سمجھتے ہوئے، موجودہ نظام کے خلاف ایک احتجاجی، مذہب فروشوں پر تمام اعتقادات کو کھوتے ہوئے، شیخ خلیفہ، علی کے اسلام کا انتخاب کرتا ہے جو کہ ایک مکتبِ احتجاج و شہادت ہے۔

ایک سادہ درویش کے لباس میں وہ ایک تنہا اجنبی کی طرح سبزوار جاتا ہے

شہر کی ایک بڑی مسجد میں ٹھہرتا ہے اور وہاں وعظ و پند کا سلسلہ شروع کرتا ہے (یہ سربداران[1] کی تحریکِ آزادی کی ابتدا خیال کی جاتی ہے) وہ ایک ایسا مبلغ ہے جو ان تمام باتوں سے بیزار ہے کہ جو لوگوں کو ظلم و جہل کے آگے جھکنے کی تعلیم دیتی ہیں۔ یہ وہ بیزاری ہے کہ جس کی حمایت عقیدہ کرتا ہے۔ ایک مکتبۂ فکر کرتا ہے اور ایک سرخ تاریخ یعنی شیعت کرتی ہے۔

آہستہ آہستہ محروم عوام اپنی راہ کو سمجھنا شروع کر دیتے ہیں کہ جس کے نتیجہ میں وہ ایک خوف زدہ کر دینے والی طاقت ہو سکیں۔ سرکاری اور نقلی ملائیت افواہیں پھیلانے اور پھر فتوے دینے کا اپنا پرانا کھیل شروع کر دیتی ہے اور آخر کار قتلِ عام کا ایک سرکاری حکم۔

شیخ دنیاوی معاملات پر مسجد میں گفتگو کرتا ہے۔[2]

۱- اس تحریک کا بانی عبدالرزاق، اولاد علی تھا اور ماں کی طرف سے سلسلہ نسب یحییٰ برمکی سے ملتا ہے۔ سربداران کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ تحریک کا بانی اپنے پیروکاروں سے کہا کرتا تھا کہ تختہ دار کی طرف قدم بڑھانا بے عزتی کی زندگی بسر کرنے سے بہتر ہے۔ یہ شیخ خلیفہ کی تعلیمات ہی کا اثر تھا کہ یہ سرفروشوں کی جماعت تیار ہوئی اور امیر عبدالرزاق نے ۷۳۶ھ میں سبزوار کا علاقہ آزاد کرایا۔ پھر اس کے بھائی امیر مسعود نے نیشاپور کا علاقہ آزاد کرایا۔

۲- آج بھی اس شہر کراچی میں یہی آوازیں آ رہی ہیں۔ اس سال جمعۃ الوداع کو بعض مساجد میں یوم القدس منانے کی کوشش کی گئی اور بڑی افسوسناک صورتِ حال سامنے آئی۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ خطبہ سے قبل بعض ائمہ مساجد نے اسرائیل اور اس کے حمایتوں کے خلاف نعرے لگائے۔ احتجاجی جلوس بھی نکالے تو ان مساجد کی انتظامیہ جیسی یہ جیسیا ہو

یہ مسجد میں قیاسی کام کرتا ہے اور اللہ کے گھر کو ناپاک کرتا ہے۔

یہ شیخ لوگوں کے مذہب کو مشتبہ بناتا ہے۔ [1]

جعلی ملا لوگوں کو شیخ کے خلاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس کے زوال کے لئے میدان تیار کرتے ہیں۔ اس کی زندگی ختم کرنے کے لئے منگولوں کی مدد کرتے ہیں۔ وہ منگول حکمرانوں کو لکھتے ہیں کہ یہ شیخ سچے سنی مذہب سے منحرف ہو گیا ہے اور ہماری بہترین کوششوں کے باوجود شرمندہ ہونے اور اپنا فیصلہ بدلنے پر تیار نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ دنیاوی افکار کا مسجد میں پروپیگنڈہ کر رہا تھا اور احتجاجوں

گئی۔ سادات کالونی کی جامعہ مسجد کے پیش امام جو کہ اصل پیش امام کے عوض امامت کر رہے تھے ان سے کہا گیا کہ آئندہ جمعہ سے تشریف نہیں لائے گا۔ مسجد بوتراب میں تو بات کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی۔ جمعۃ الوداع کو جو تلخی پیدا ہوئی تھی اس کی انتہا عید الفطر کے بعد آنے والے جمعہ کو ہو گئی۔ چند مشتعل نوجوانوں نے مسجد و امام بارگاہ کی انتظامیہ کے کرتا دھرتا جناب مختار زیدی پر دست درازی کی۔ ہوا یہ کہ بوتراب جامع مسجد کے پیش امام مولانا سید محمد صاحب قبلہ نجفی کی تقریر کے جواب میں جناب مختار زیدی نے کچھ کہنا چاہا مگر ان کی بات نہیں سنی گئی۔ صفائی کا موقعہ ہر شخص کو دینا چاہیئے۔ چاہے وہ بظاہر قصوروار ہی نظر آتا ہو۔ ہماری معلومات کے مطابق مولانا سید محمد صاحب قبلہ نجفی بڑے نیک نفس اور کم گو انسان ہیں اور جناب مختار زیدی کی قومی خدمات بھی قابل قدر ہیں۔ مسئلہ صرف "سوچ" کا ہے۔ ہم تمام امام بارگاہوں کی انتظامیہ سے صرف اتنا عرض کریں گے کہ وہ اپنا انداز فکر بدلیں۔ زمانہ بہت بدل چکا ہے۔ یہ علم و دانش اور آزادی و انقلاب کا دور ہے۔

۱۔ شیخ خلیفہ کو مطعون کرنے والے تو وحشی منگولوں کے حاشیہ بردار دوسرے فرقے کے مولوی تھے۔ آپ کا تعلق تو ایسے مکتب فکر سے ہے کہ جس کا طرۂ امتیاز ظلم کے خلاف احتجاج ہے اس کتاب کی نوعیت زیادہ تفصیل میں جانے کی اجازت نہیں دیتی۔ مگر اتنا تو بتا دیجئے کہ ظلم

(نیبوں) کے کام کو پھیلا رہا تھا۔ اس کا رنگ ڈھنگ موت کو دعوت دیتا ہے اور یہ سلطان سعید پر منحصر ہے کہ وہ مذہب کو اس وبا سے نجات دلائے۔

اس کے خلاف افواہیں پھیلتی ہیں۔ لوگوں کو اس کے خلاف ابھارا جاتا ہے مگر شیخ کی طرف سے اتحاد، عقیدے اور نجات کی دعوت محروم اور مصیبت زدہ دیہی عوام کے دلوں کو زیادہ سے زیادہ کھینچتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ سویرے ایک صبح کو جب اس کے مداح معمول کے مطابق مسجد میں پہنچتے ہیں تو وہاں اس کی لاش دیکھتے ہیں۔

شیخ کے قتل کے بعد ان کے ایک پیرو، شیخ حسن جوری، اس کے کام کو جاری رکھتے ہیں۔ وہ فوراً ہتھیار اٹھانے کی دعوت دیتے ہیں، اپنی پیروی کرنے والوں کو منظم کرتے ہیں اور زیر زمین چلے جاتے ہیں۔ وہ شہر شہر گھومنا شروع کرتے ہیں۔ اتحاد اور انقلاب کے بیج بوتے ہیں۔ وہ جہاں بھی جاتے ہیں شیعیت کی بنیاد پر جاتے ہیں، لوگوں کے ذہن تیار کئے جاتے ہیں۔ غلام عوام کے دل انقلاب کے لئے دھڑکتے ہیں۔ مگر خاموشی سے۔ ایک چنگاری کافی ہوتی ہے۔ ایک حاکم کا بھتیجا باشتین کے گاؤں میں داخل ہوتا ہے۔ جیسا کہ عام طور سے کیا کرتا تھا۔ یہ گاؤں سبزوار سے پینتیس کلومیٹر جنوب میں تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ عبدالرزاق کے گھر میں داخل ہوتا ہے یہ شخص نیک اور باعزت دیہاتیوں میں سے تھا اور حاکم کے مذہبی

کے خلاف احتجاج اور انسانی مسائل پر گفتگو کے لئے اللہ کے گھر اور دربار حسینی سے زیادہ اور مناسب جگہ کون سی ہے۔ ہمیں یہ یقین کر لینا چاہیئے کہ اسلامی عبادت گاہیں دیگر مذاہب کی طرح محض رسمی عبادات کی جگہ نہیں ہیں۔

پروپیگنڈے کے تباہ کن اثرات تلے ہنوز سسک رہا تھا۔

نوکر چاکران دیہاتیوں سے کھانے کے لئے پوچھتے ہیں اور پھر اچھی طرح سے ان کے سامنے پیش بھی کرتے ہیں۔ تب وہ شراب مانگتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے کہ جو مسلمان اور شیعہ ہوں اور شیخ خلیفہ کی تعلیمات سے بہت زیادہ متاثر ہوں، شراب لانا اور وہ بھی جبریہ ایسے بدمعاشوں کے لئے۔ حد ہو گئی۔ جہاں مدہوش ہو جاتے ہیں۔ وہ عورتیں طلب کرتے ہیں۔ یہ دھماکے کی ابتدا ہوتی ہے۔ بہت سادہ اور تیزی سے!

میزبان لوگوں کے پاس جاتا ہے۔ شیعہ عوام کو بلاتا ہے اور چیخ اٹھتا ہے کہ منگول تمہاری عورتیں مانگ رہے ہیں۔ ان کا جواب کیا ہوتا ہے۔؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم اتنے ذلیل ہونے کے بجائے مرنے کو تیار ہیں۔ ہماری عورتوں کے بجائے تو دشمن کے لئے ہماری تلواریں ہوں گی۔

نتیجہ ظاہر ہے۔ عوام اپنے ذہنوں کو تیار کر چکے ہیں۔ وہ پورے گروہ کو ایک ساتھ قتل کر دیتے ہیں۔ جیساکہ وہ جانتے ہیں کہ یہاں پیٹھ پھیرنا نہیں ہے۔ جیساکہ وہ جانتے ہیں کہ ہم پہلے ہی موت کو پسند کرتے ہیں۔ وہ پس و پیش ختم کر دیتے ہیں موت کا انتخاب انہیں ایسی طاقت عطا کرتا ہے کہ ان کا ایک اکیلا گاؤں۔ خون کی پیاسی حکومت کے خلاف بغاوت کرتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے۔

دیہاتی شہر کو تہہ و بالا کر ڈالتے ہیں۔ وہ منگول فوج اور ریاستی مذہب کے جعلی ملاؤں کے فتوؤں کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔ وہ فاتح ہیں اور ان کی صدا: نجات اور عدل! حکمران منگولوں کی طاقت، سرکاری پروہتوں کے اثرات اور

حکمراں طبقہ کے بڑے زمینداروں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا۔

جعلی ملائیت کے جہل کا شکار اور منگولوں کے ظلم میں گرفتار لوگ باغیوں کی صفوں میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔ سبزوار طاقت کا مرکز بن جاتا ہے۔ ایک آگ کی طرح کہ خشک جھاڑیوں میں پھیل جاتی ہے۔ جنہیں جنگجو دیہاتیوں اور عوام کے نمائندہ قسم کے لوگوں کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔ شیعہ انقلابی ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ شیخ خلیفہ اور شیخ حسن کے افکار اور ان کی طرح کے آگاہ، صالح اور مشنری طرز کے مردان علم و فضل پورے خراسان کو گھیر لیتے ہیں۔ شمالی اور جنوبی ایران میں شعلے بھڑکا دیتے ہیں۔

اور پہلی مرتبہ ایک شیعہ انقلابی تحریک جس کی بنیاد علوی شیعت پر تھی غیر ملکی تسلط اور ملکی فریب کاری، جاگیرداروں کی طاقت اور بڑے سرمایہ داروں کے خلاف، غلام قوموں اور محروم عوام کی نجات کی خاطر ہتھیار لیکر اٹھتی ہے۔ اس تحریک کی رہنمائی سات سو سال پہلے کسانوں نے عدل و شہادت کے پرچم تلے کی تھی۔

یہ علوی شیعت کی آخری انقلابی لہر ہے۔ سرخ شیعت سات سو سال سے انقلابی روح کے شعلوں کی طرح آزادی اور عدل کے متلاشی لوگوں کی طرف مائل اور ظلم، غربت، جہالت کے خلاف بے رحمی سے جنگ کرتے ہوئے جاری رہتی ہے۔

ایک صدی بعد صفوی آئے اور شیعت عظیم عوامی مسجد سے شاہی مسجد میں[1] عالی قاپو کے محل کا پڑوسی بننے کے لئے رخصت ہوئی۔ سرخ شیعت سیاہ شیعت میں تبدیل ہو گئی شہادت کا مذہب ماتم کا مذہب بن گیا۔

۱۔ ایک مشہور شاہی عمارت جس میں محلات شاہی کے دروازے کھلتے تھے اور داہنی طرف ایک عالیشان مسجد کہ جسے شاہ عباس صفوی نے ۱۸ برس کے طویل عرصہ میں بڑا خوبصورت بنوایا تھا۔